قرآن کی شناخت

از آیت اللہ شہید مطہری

قرآن مجید وہ مقدس کتاب ہے جو خداوند عالم کی طرف سے نازل ہوئی ہے جس کا بنیادی مقصد بنی نوع انسان کی ہدایت ورہنمائی ہے تاکہ وہ دنیا کی رعنائیوں میں اس قدر گرفتار نہ ہوکہ اسے راہ نجات کی فکر ہی نہ رہ جائے۔ واضح رہے کہ راہِ نجات وصراط مستقیم کی نشاندہی کے لئے خداوند عالم نے پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے قبل ہزاروں انبیاء علیہم السلام ارسال فرمائے اور متعدد مقدس کتابیں اور آسمانی صحف بھی نازل کئے لیکن قرآن مجید کا شرف امتیاز یہ ہے کہ یہ اللہ کی آخری کتاب ہے اور ہمارے پیغمبر آخر الزماں کا معجزہ جاوید ہے واضح رہے کہ قیامت تک قرآنی ارشادات اور پیغمبر آخر الزماں کی ہدایتوں کی تعمیل کے ذریعہ ہی خداوند عالم کی رضا وخوشنودی ممکن ہے جس کو انسانی حیات کا ماحصل قرار دینا مبالغہ نہ ہوگا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ اسلام دشمن سامراجی طاقتوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ امت اسلامیہ قرآن اور قرآنی علوم ومعارف کی گہرائیوں سے ناواقف رہ جائے وہ زبان سے قرآنی عبارت کی تلاوت تو کرے لیکن اس کتاب میں کیا کہا گیا ہے اس کی طرف متوجہ نہ ہونے پائے۔ خوبصورت اور بیش قیمت غلاف میں اس کتاب کو گھر کی سب سے زیادہ اونچی جگہ پر رکھا جائے لیکن انسان اس میں مذکور اعلیٰ افکار وعقائد سے ناواقف رہ جائے۔ ایسے نامساعد اور اسلام دشمن ماحول میں قرآن کی شناخت ومعرفت کی کیا اہمیت ہے اس کا اندازہ آیت اللہ شہید مطہری کے درج ذیل مضمون سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ (ادارہ)

ہر عالم اور ہر مومن کے لئے قرآن کی شناخت واجب وضروری ہے لیکن ایک انسان شناس اور معاشرہ شناس عالم کے لئے قرآن کی شناخت اس لئے بہت ضروری ہے کہ اسلامی معاشرے کی سرنوشت بلکہ بشریت کی تکوین سرنوشت میں قرآن نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ تاریخ کے سرسری مطالعہ سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ بشری معاشرہ تو خیر! ہر انسان کی زندگی پر عملی طور سے قرآن نے جو اثر چھوڑا ہے کسی دوسری کتاب نے اسے اتنا متاثر نہیں کیا ہے۔

اسی لئے قرآن خود بخود علم سماجیات کی بحث میں داخل ہوکر اس علم کے تحقیقاتی موضوعات کا جزو بن جاتا ہے۔ میری اس گفتگو کا مطلب یہ ہے کہ اس چودہ سوسال کے عرصے میں دنیوی تاریخ کی تحقیق عموماً اور اسلامی معاشرے کی شناخت خصوصاً قرآن کی شناخت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ قرآن

کی شناخت ایک مرد مسلمان ومومن کے لئے اس لئے ضروری ہے کہ مسلمان کے دین وایمان کی بنیاد کا اصلی منبع یہی مقدس کتاب ہے جو مرد مومن کو نہ صرف حرارت زندگی عطا کرتی ہے بلکہ اس کی زندگی کو روحانی عظمتوں سے مالامال کردیتی ہے۔

قرآن ایسی مذہبی کتابوں کی طرح نہیں ہے جن میں صرف خدا خلقت وتکوین کے سلسلے میں مسائل اور زیادہ سے زیادہ کچھ اخلاقی نصیحتیں ہوں اور اس کے سوا کچھ اور ان کتابوں کے ماننے والے دیگر منابع سے دستور وافکار لینے پر مجبور ہوں۔نہیں ایسا ہرگزنہیں ہے بلکہ ہر انسان کے لئے ایک ''باایمان'' موجود ہونے کے ناطے جن عقائد وافکار کا جاننا ضروری ہے اور جن اصول تربیت واخلاق اور اجتماعی وخانوادگی نظام کی ضرورت ہوتی ہے ان سب کو قرآن نے اپنے دامن میں محفوظ رکھا ہے ۔ صرف تفسیر وتوضیح وتشریح کو اور کبھی کبھی اجتہاد یعنی تطبیق اصول بر فروع کو سنت کے ذریعہ مجتہد کی ذمہ داری کے حوالے کردیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی منبع سے استفادہ شناخت قرآن سے قبل غیر ممکن ہے قرآن تمام دیگر منابع کا معیار وپیمانہ ہے۔ حدیث وسنت کو بھی قرآنی معیار پر پرکھنا ضروری ہے کیونکہ جواحادیث وسنن،قرآن کے مطابق ہیں ہم صرف انہی کو قبول کریں گے۔

قرآن مجید کے بعد احادیث کے سلسلے میں سب سے معتبر اور مقدس ترین مآخذ ہمارے یہاں کتب اربعہ ہیں۔ کافی،من لایحضرہ الفقیہ، تھذیب الاحکام، استبصار --اورخطبوں میں نہج البلاغہ اور دعاؤں میں صحیفہ سجادیہ ہے۔لیکن یہ سب قرآن ہی پر موقوف ہیں لیکن قرآن کے برابر قطعی الصدورنہیں ہیں۔کتاب کافی اتنی ہی معتبر ہے کہ جتنی قرآن کے مطابق اور تعلیمات قرآن کے موافق ہے ۔خود رسول اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ کا فرمان ہے ہماری حدیثوں کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھ کردیکھو اگر وہ قرآن کے مطابق نہیں ہیں تو سمجھ لو کہ جعلی ومن گھڑت ہیں اور لوگوں نے ہماری طرف غلط نسبت دی ہے کیونکہ ہم قرآن کی موافقت کے بغیر کچھ کہتے ہی نہیں ہیں!

شناخت قرآن کی قسمیں

جب یہ بات طے ہوگئی کہ ''شناخت قرآن'' کی ضرورت ہے تو اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس کتاب کی شناخت کیونکر ہوسکتی ہے؟ ہر کتاب کے مطالعہ اور اس کی تحقیق کے لئے بطور کلی تین قسم کی معلومات کا فراہم ہونا ضروری ہے۔

سند یا انتساب

اس سلسلے میں سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ کتاب کی نسبت جس مصنف یا مؤلف کی طرف دی گئی ہے وہ کس حد تک یقینی ہے؟ مثلاً فرض کیجئے ہم دیوان حافظ یا دیوان خیام یا دیوان غالب کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ حافظ کی طرف منسوب تمام دواوین حافظ ہی کے ہیں یا ان میں سے کچھ تو واقعاً حافظ کے ہیں باقی سب حافظ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں جو حافظ کے نہیں ہیں۔ اسی طرح خیام وغالب کے دیوانوں کو دیکھنا پڑے گا۔ اور یہیں سے نسخوں کا مسئلہ اٹھ کھڑے ہوتا ہے کہ ان میں سب سے قدیم اور سب سے زیادہ معتبر نسخہ کونسا ہے؟ اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ دنیا کی ہر کتاب کے لئے یہی بات ہوگی۔

حافظ کا وہ دیوان جسے مرحوم قزوینی نے شائع کیا ہے اور جس کی صحت میں معتبر ترین نسخوں سے استفادہ کیا گیا ہے ۔ وہ حافظ کے ان عام دیوانوں سے جو بمبئی یا ایران میں چھپے ہیں اور جن کے نسخے حافظ کے خاندان میں موجود ہیں ان سے کافی مختلف ہے۔ حافظ کے وہ نسخے جو ۳۰، ۴۰ سال پہلے چھپے ہیں آج کے ان نسخوں کے مقابلے میں جنہیں ماہرین معتبر سمجھتے ہیں تقریباً حجم میں دوگنے ہیں۔ حالانکہ ماہرین نے جن اشعار کو جعلی اور حافظ کی طرف ان کی نسبت کو غلط بتایا ہے ان میں کبھی ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جو حافظ کے اعلیٰ معیار پر پورے اترتے ہیں جو سب ایک ہی سطح کی ہیں اور اگر ان میں کوئی اختلاف ہے بھی تو صرف اسی قدر جو دیگر شعراء کے یہاں ہوتا ہے، حالانکہ اگر آپ تاریخی لحاظ سے ماضی کی طرف دیکھتے چلے جائیں اور خیام سے قریب تر جو زمانہ ہے تو اس میں آپ کو یقینی طور سے یہ ملے گا کہ جو تعداد خیام کی طرف قطعی وحتمی طور پر سے منسوب ہے وہ شاید بیس سے بھی کم ہو۔ باقی کی صحت مشکوک ہے یا پھر وہ قطعاً دوسروں سے متعلق ہیں۔

اس لئے کسی بھی کتاب کی شناخت کے لئے سب سے پہلا مرحلہ تو یہ ہے کہ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے با اعتبار سند اس کا قائل یا اس کا لانے والا کس قدر معتبر ہے؟ آیا سب ہی کی سند معتبر ودرست ہے یا اس کا کچھ حصہ تو معتبر ہے اور کچھ غیر معتبر، ایسی صورت میں کتنے فیصد مطالب کی تائید ہم انتساب کے اعتبار سے کر سکتے ہیں؟ اس کے علاوہ ہم کس دلیل کی بناء پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ کچھ حصہ معتبر اور کچھ قطعاً غیر معتبر اور کچھ مشکوک ہے؟

اس قسم کی شناخت کا وجود قرآن میں نہیں ہے اور صرف قرآن ہی دنیا کی وہ واحد قدیم ترین کتاب ہے کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود اب تک بغیر شک وشبہ کے باقی ہے۔ اس کے اندر ایسے مسائل کہ'' فلاح سورہ مشکوک ہے فلاں آیت فلاں نسخہ میں ہے، فلاں میں نہیں ہے'' کا کہیں وجود نہیں ہے۔ اس بات میں ذرہ برابر شک نہیں ہے کہ ان تمام آیات کے لانے والے محمد بن عبداللہ ہیں کہ ان تمام آیتوں کو بعنوان معجزہ اور کلام الٰہی آپؐ ہی لائے نہ کوئی شخص مدعی ہے اور نہ کسی نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ قرآن کا کوئی دوسرا نسخہ موجود تھا یا موجود ہے بلکہ اب تک دنیا میں کوئی ایسا مستشرق نہیں پیدا ہوا جو قرآن شناسی کے سلسلے میں کہے کہ قرآن کے قدیم ترین نسخوں کو تلاش کرکے دیکھنا چاہئے کہ اس میں کیا چیزیں ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ تورات، انجیل، اوستا، شاہنامہ گلستان اور دوسری کتابوں کے لئے یہ احتمال ہے مگر قرآن کے بارے میں ایسا کوئی احتمال موجود نہیں ہے۔

قرآن ایک مقدس ترین کتاب ہونے کے ساتھ ساتھ پیغمبر اسلامؐ کے دعوے پر برہان صادق اور دلیل محکم بھی ہے اور رسول اسلام کا سب سے بڑا معجزہ بھی یہی ہے۔ ایک خصوصیت قرآن کی یہ بھی ہے کہ یہ وہ تورات کی طرح ایک ہی مرتبہ نازل نہیں ہوا کہ بعد میں یہ اعتراض اٹھ سکے کہ اس کا اصل نسخہ کون سا ہے بلکہ قرآن کی آیتیں ۲۳ سال تک وقتاً فوقتاً ضرورت کی بناء پر بتدریج نازل ہوتی رہیں اور پہلے ہی دن سے مسلمانوں نے قرآن کی آیتوں کو حفظ وضبط کرنا شروع کردیا اور جس طرح ایک تشنہ لب ٹھنڈے وشیریں پانی کا طلبگار ہوتا ہے قرآنی آیات کے سلسلے میں مسلمانوں پر ہمیشہ یہی کیفیت طاری رہی۔

اس کے علاوہ اس زمانے میں مسلمانوں کے پاس کوئی دوسری کتاب بھی نہیں تھی جس کے حفظ اور ضبط پر مسلمان مجبور ہوں، چونکہ نوعا مسلمان لکھے پڑھے نہیں تھے اور بالکل خالی الذہن تھے اور بے پناہ حافظہ کے مالک تھے اور قرآن کی لطافت وبلاغت ان کے مزاج کے موافق تھی اس لئے آیات قرآنی ان کے سینوں میں اس طرح پیوست ہوجاتی تھی جس طرح پتھر پر نقش۔ اور چونکہ یہ لوگ قرآن کو خدا کا کلام سمجھتے تھے اس لئے اس کو مقدس سمجھتے تھے اور ایک کلمہ یا ایک حرف میں ردوبدل کے قائل نہ تھے نہ آگے پیچھے کرنے کو جائز جانتے تھے اور ان کی کوشش رہتی تھی کہ خدا سے قربت کا ذریعہ صرف تلاوت قرآن ہے اس لئے بیشتر اوقات مشغول تلاوت رہا کرتے تھے یہی اسباب تھے کہ قرآن میں کسی قسم کی تحریف نہ ہوسکی۔

اس کے علاوہ نزول قرآن کے پہلے دن سے رسول اکرمؐ نے کچھ مخصوص افراد کو قرآن کی کتابت کے لئے متعین کردیا تھا جو ہر نازل ہونے والی آیت کو لکھ لیا کرتے تھے۔ انکو ''کتاب وحی'' کہا جاتا تھا۔ اس قسم کے اسباب حفاظت کسی بھی قدیمی کتاب کو حاصل نہیں ہوسکے اور انہیں اسباب کی بناء پر وہ تمام اقسام کی تحریف سے محفوظ ومصؤن رہا۔منجملہ دیگر اسباب قبولیت کے لوگوں میں قرآن کے مقبول ہونے کا ایک اہم سبب اس کتاب کا غیر معمولی فصاحت وبلاغت کا حامل ہونا تھا۔ قرآن کی ادبیت لوگوں کو فوراً اپنی طرف کھینچ لیتی تھی اور لوگ بڑی جلدی سے اسے حفظ کر لیتے تھے۔

برخلاف دیگر ادبی کتابوں کے مثلاً دیوان حافظ ،مثنوی مولانا روم وغیرہ کہ جو حضرات اس سے دلچسپی رکھتے ہیں اس میں اپنی مرضی سے افسانہ وکمی کردیتے ہیں تاکہ اپنی نظر میں اسے کامل تر کر دیں۔لیکن قرآن کے سلسلے میں کسی کی یہ ہمت نہیں تھی کہ ذرا سی ترمیم وتنسیخ کرسکے۔ کیونکہ اگر کوئی سوچتا بھی ہوگا تو قرآن کی یہ آیت:ولوتقوّل علینا بعض الاقاویل☆لاخذنا منه بالیمین☆ ثم لقطعنا منه الوتین ☆[۱]

ترجمہ:'' اگر اس نے گھڑہ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اس کو دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے اور اس کی رگ گردن کاٹ ڈالتے''۔ اور اس کے علاوہ دوسری آیتیں خداپر جھوٹ باندھنے کے عظیم گناہ کو آشکار کردیتی ہیں اور اس سے ہر شخص کے ذہن میں یہ بات میں بیٹھ جاتی تھی اور اس امر کے خیال سے بھی دوری اختیار کرتا ہے۔ اس طرح اس آسمانی کتاب میں تحریف ہونے سے پہلے پہلے اس کی آیتیں متواتر ہوگئیں اور اس منزل پر پہنچ گئیں کہ ان کے انکار یا ایک حرف کی بھی کمی بازیابی کا امکان ہی ختم ہوگیا۔ لہٰذا قرآن کے بارے میں اس قسم کی بحث کی گنجائش ہی نہیں ہے اور ہر قرآن شناس قرآن کے بارے میں اس بحث کو لغو سمجھتا ہے۔

ہاں ایک نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ جب اسلامی حکومت چڑھتے ہوئے سورج کی طرح تمام دنیا کو اپنے زیر نگیں کررہی تھی اور تمام دنیا کی نظریں قرآن کی طرف لگی تھیں۔ اور مدینہ سے، جو حافظان قرآن وصحابہ کا مرکز تھا، عام مسلمانوں کی دوری تھی اس وقت یہ خطرہ بہت زیادہ تھا کہ رفتہ رفتہ کم از کم دور افتادہ مقامات پر عمداً یا سہواً یا اشتباہاً قرآن کے نسخوں میں کچھ کمی وبیشی یا رد وبدل ہوجائے لیکن مسلمانوں کی ذہانت اور موقع شناسی نے قرآن کو اس سے بچالیا اور مسلمانوں نے تو پہلی صدی ہی کے پانچ دہائیوں تک اس سر پر منڈ لانے والے خطرہ کو محسوس کرلیا تھا۔اس لئے

حافظا قرآن اور صحابہ کرام کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دور افتادہ مسلمانوں کے لئے مدینہ سے تصدیق شدہ قرآن کے نسخے بھیج دئے گئے تا کہ اس میں کوئی کمی یا زیادتی جان بوجھ کر یا بھولے سے بھی نہ ہونے پائے اور اس طرح قرآن کو ہمیشہ کے لئے تحریف سے بچا لیا گیا اور خصوصاً یہودیوں کی دسیسہ کاریوں اور مکاریوں سے محفوظ کرلیا گیا جن کا مشغلہ ہی یہی تھا۔

شناخت تحلیلی

شناخت تحلیلی سے مراد اس بات کو طے کرنا ہے کہ کتاب کن مطالب پر مشتمل ہے؟ کس مقصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے؟ کائنات کے بارے میں اس کتاب کا کیا نظریہ ہے؟ انسان کے بارے میں اس کا کیا تصور ہے؟ معاشرے کے بارے میں کونسا زاویہ نگاہ ہے؟ کتاب کے مطالب کو کس انداز سے پیش کیا گیا ہے؟ مسائل کو حل کرنے کے کیا انداز ہیں؟ اس کتاب کا نقطہ نظر فلسفیانہ ہے یا آج کی اصطلاح میں عالمانہ ہے؟ یہ کتاب واقعات کو ایک عارف کی نگاہ سے دیکھتی ہے یا اس کا خود اپنا ایک مخصوص انداز ہے؟اس کے فوراً بعد دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ کتاب بشریت کے لئے کوئی پیغام یا رہنمائی کا کام انجام دیتی ہے یا نہیں؟ اب اگر جواب مثبت ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ پیغام کیا ہے؟مختصر یہ کہ پہلی قسم کے سوالات اس بات سے مربوط ہیں کہ کائنات، انسان، حیوان، زندگی، اور موت وغیرہ کے بارے میں کتاب کا کیا نظریہ ہے؟ اس بات کو جامع لفظوں میں اس طرح بھی کہاجاسکتا ہے کہ کتاب ''آفاقیت'' سے مربوط ہے یا بقول اہل فلسفہ یہ کتاب حکمت نظری سے متعلق ہے۔ (حکمت عملی سے نہیں)لیکن دوسری قسم کے سوالات کا مقصد یہ ہے کہ کتاب انسانی مستقبل کے لئے کیا نظریہ پیش کرتی ہے انسانی اور انسانی معاشرے کو کس نمونہ کی بنیاد پر تربیت کرنی چاہئے؟ اسی کو ہم ''کتاب کا پیغام'' کہتے ہیں۔بہرحال اس قسم کی شناخت مشتملات کتاب سے مربوط ہے اور ہر کتاب کے بارے میں اس نظریہ سے بحث کی جاسکتی ہے چاہے وہ بوعلی سینا کی کتاب شفاہو یا سعدی کی گلستان! یہ بھی ممکن ہے کہ کسی کتاب کے اندر نہ تو کوئی نظریہ پیش کیا گیا ہوا اور نہ کوئی پیغام! یا اس میں صرف نظریات سے بحث ہو پیغام کا نام ونشان بھی نہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کتاب دونوں باتوں کی حامل ہو۔

قرآن کی شناخت تحلیلی کے سلسلے میں ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ قرآن مجموعی طور سے کن مسائل پر مشتمل ہے؟ اور قرآن نے ان مسائل کو کس طرح پیش کیا ہے؟ مختلف چیزوں کے بارے میں قرآن

کے احتجاجات استدلات کس قسم کے ہیں؟ آیا چونکہ قرآن ایمان کا محافظ ونگہبان ہے اور اس کا پیغام ایک ایمانی پیغام ہے وہ عقل کو ایک رقیب کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ عقل کے تمام تہاجم کی روک تہام کرے اور رقیب کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دے یا اس کے برعکس عقل کو ایک مددگار اور دفاع کرنے والے کی نظرے دیکھتا ہے اور اس کی طاقت سے مدد حاصل کرتا ہے۔ یہ سوالات اور اس قسم کے سینکڑوں سوالات ہیں جو قرآن کی شناخت تحلیلی کے سلسلے میں پیش آتے ہیں جو قرآن کی ماہیت سے آشنا کرتے ہیں۔

بنیادی شناخت:

جب کسی کتاب کا استناد وانتساب صحیح طریقے سے کسی مصنف کی طرف ثابت ہوجائے اور مضامین کتاب کی باقاعدہ تحقیق ہوجائے تو پھر اس کے بعد یہ تحقیق کرنا چاہئے کہ کتاب میں درج مضامین خود مصنف کے افکار وخیالات ہیں یا مصنف نے دوسروں کے مفاہیم کو اپنے الفاظ کے سانچے میں ڈھالا ہے مثلاً دیوان حافظ ہی کو لے لیجئے کہ اس کی مستند تحقیق اور تحلیلی شناخت کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ حافظ نے جن مطالب وافکار کو کلمات جملوں، اشعار کے سانچے میں ڈھالا ہے اور اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے یہ سب خود حافظ کی ایجاد واختراع ہے یا صرف الفاظ، کلمات، خوبصورتی وزیبائی تو حافظ کی ہے لیکن فکرومطالب کسی ایک یا کئی دوسرے افراد کی مرہون منت ہے۔

اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ حافظ کی ہنری اصالت ثابت ہونے کے بعد ان کی اصالت فکری بھی ثابت ہونی چاہئے۔ممکن ہے کہ حافظ ایک ہنرمند شخص ہوں، نہ مفکر ہوں نہ عارف اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ہنرمند ہونے کے ساتھ ساتھ مفکر بھی ہوں اور عارف بھی۔ حافظ کے بارے میں جو بات طے شدہ ہے وہ یہ ہے کہ حافظ کا شمار شاعر ہونے سے پہلے علماء میں ہوتا تھا۔ وہ دوسروں کے افکار وتحریر سے بہت پہلے سے واقف تھے شعراء ادباء مفسرین، فقہا کے افکار وکتب سے خاصی واقفیت رکھتے تھے، خصوصاً عرفا کے کلام سے بہت زیادہ واقف تھے اور یہ بات مطالعہ کی مرہون منت نہیں تھی بلکہ تمام یا اکثر چیزوں کو اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرکے حاصل کیا تھا۔ اگرچہ ہمارے زمانے میں حافظ صرف شاعر ہونے کے ناطے پہچانے جاتے ہیں۔ بحیثیت عالم ان کو کوئی نہیں جانتا۔ حالانکہ وہ اپنے زمانے میں ایک برجستہ عالم تھے جو کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا

کرتے تھے۔ حافظ کے زمانے سے قریب جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں حافظ کے لئے جو القاب استعمال کئے گئے ہیں وہ زیادہ تر عالم کے لئے استعمال ہوتے ہیں نہ کہ شاعر کے لئے۔اب اس جیسے عالم کے لئے ---جو اپنی زبان کے اصولوں سے باقاعدہ واقف تھا اور عرفان وسیروسلوک معنوی کے بارے میں کافی سے زیادہ معلومات رکھتا تھا۔سلوک عرفانی کی منازل کو دوسرے فارسی شاعروں کی بہ نسبت جس نے اپنے اشعار میں زیادہ استعمال کیا ہے--- یہ سوال اٹھتا ہے کہ ان افکار کے پیش کرنے میں حافظ صرف مقلد تھے یا ان خیالات کے موجد بھی ؟ اسی طرح مثلاً محی الدین اندلسی جن کو اسلامی عرفان کا بابا آدم کہا جاتا ہے،حافظ سے متاثر تھے کہ نہیں ؟ یا ابن فارس مصری جن کا زمانہ حافظ کے زمانے سے پہلے ہے۔ اور جو عربی وعرفانی ادبیات میں وہی اہمیت رکھتے ہیں جو حافظ فارسی ادبیات میں رکھتے ہیں۔ حافظ نے ان کے افکار سے استفادہ کیا ہے یا نہیں؟ یعنی ابن فارس نے حافظ کو متاثر کیا ہے یا نہیں؟ یہ تمام چیزیں بنیادی مسائل کے بارے میں تحقیق کرنے والوں کا فریضہ ہے کہ ان تمام باتوں کا مفصل جواب دیں !

حافظ ہوں کوئی دوسرا مؤلف--- مولف کے افکار وخیالات کے بارے میں بنیادی مسائل کی تحقیق کا ایک طریقہ ہے اور اس قسم کی شناخت ،تحلیلی شناخت پر موقف ہوا کرتی ہے کہ پہلے تو بڑی باریک بینی کے ساتھ مؤلف کے افکار وخیالات کے بارے میں شناخت حاصل کی جائے اس کے بعد بنیادی شناخت کے بارے میں اقدام کیا جائے۔اور اگر اس صورت کار کو اختیار نہ کیا گیا تو اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو بہت سے ایسے علوم کے تاریخ نویسوں کا ہوتا ہے جو علوم سے نہ آشنا ہونے کے باوجود علوم کی تاریخ لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔اس سلسلے میں بعض ان فلسفی کتابوں کے مؤلفین کا نام لیا جاسکتا ہے جو ابن سینا اور ارسطو اور ان کے متشابہات ومتفرقات کے بارے میں سینکڑوں صفحات سیاہ کردیتے ہیں ، حالانکہ نہ وہ ابن سینا کے بارے میں کچھ جانتے ہیں نہ ارسطو کے بارے میں واقفیت رکھتے ہیں۔ ان مؤلفین کی حالت یہ ہے کہ ذراسی لفظی مشابہت مل جانے پر فوراً فیصلہ کرنے لگتے ہیں حالانکہ مقابلہ کرنے کے لئے بڑے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے اور ابن سینا وارسطو جیسے فلسفیوں کے افکار وخیالات کی گہرائی کو سمجھنے کے لئے ایک عمر کی ضرورت ہے اور اس کے بغیر اگر کچھ لکھا جائے گا تو وہ ظن وتخمین اور اندھی تقلید کے سوا کچھ بھی نہ ہوگا۔

قرآن کا تینوں مرحلوں میں استقلال

قرآن کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ یہ تینوں مرحلوں میں اصالت کا حامل ہے یعنی جہاں تک پہلی اصالت...اصالت انتساب کا سوال ہے وہ مسلم ہے یعنی قدیمی نسخوں کی تلاش وجستجو کے بغیر بلا جھجک یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آج جس کتاب کو بنام قرآن پڑھا جاتا ہے یہ بعینہ وہی قرآن ہے جس کو پیغمبر اسلام نے دنیا کے سامنے پیش فرمایا تھا۔

اسی طرح دوسری اصالت یعنی مطالب قرآن کا اصلی ہونا ہے یہ بھی واضح ہے کہ قرآن کوئی اقتباسی یا نقلی کتاب نہیں ہے بلکہ اس سے تمام مضامین ابتکاری نہیں۔اب رہی تیسری اصالت یعنی یہ قرآن الٰہی کلام ہے اس کے مطالب حضرت رسولؐ کے ذہن وفکر کی تخلیق نہیں ہیں بلکہ یہ خدا کا کلام ہے۔ آنحضرتؐ کی حیثیت صرف ''حامل وحی'' کی ہے ۔قرآن کی بنیادی تحقیق کرنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے جس طرح دوسری اصالت شناخت تحلیل کا بھی یہی نتیجہ ہے۔

قرآن کی بنیادی تحقیق دوسری قسم کی شناخت پر موقوف ہے، اس لئے ہم اپنی بحث کا آغاز شناخت تحلیلی سے کریں گے یعنی ہم پہلے یہ تحقیق کریں گے کہ قرآن کے مضامین کیا میں؟ کون سے وہ مسائل ہیں جو قرآن نے پیش کئے ہیں ۔ اور وہ کون سے مسائل ہیں جن کے بارے میں قرآن بہت زیادہ حساس ہے، کن موضوعات کو قرآن نے پیش کیا ہے اگر شناخت تحلیلی کا مرحلہ بخوبی انجام پا گیا اور معارف قرآن سے کافی واقفیت حاصل کرلی تو پھر ہم اس اصالت تک پہونچیں گے جو عمدہ ترین اصالت کہی جاتی ہے یعنی ''اصالت الٰہی'' اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن معجزہ ہے۔

شناخت قرآن کی شرائط:

قرآن کی شناخت کے لئے چند مقدمات کا مختصراً بیان کرنا ضروری ہے۔

۱۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ عربی زبان کو بخوبی جانتا ہو۔ کیونکہ جس طرح حافظ وسعدی کے بارے میں آدمی اس وقت معقول جانکاری نہیں حاصل کرسکتا جب تک فارسی زبان کو نہ جانتا ہو۔ اسی طرح عربی زبان میں لکھے ہوئے قرآن سے اس وقت تک واقفیت نہیں حاصل ہوسکتی جب تک عربی زبان نہ جانتا ہو۔

۲۔ دوسری شرط تاریخ اسلام سے واقفیت کی ہے کیونکہ قرآن توریت وانجیل کی طرح کی

کتاب نہیں ہے جو ایک ہی مرتبہ میں پیغمبر کے واسطہ سے اس کی امت کے لئے بھیج دی گئی ہو۔ بلکہ قرآن بعثت سے لے کر وفات تک کے ۲۳ سالہ حیات پیغمبرؐ کے زمانے میں وقتاً فوقتاً نازل ہوتا رہا ہے اور اسی لئے آیات قرآنی کے لئے شان نزول کا جاننا بھی ضروری ہے۔ شان نزول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آیت کے معنی کو محدود کردے بلکہ اس کا مطلب مضمون آیت کو مزید واضح و روشن کرنا ہے۔

۳۔ تیسری شرط یہ ہے کہ خود پیغمبر اسلامؐ کے کلام سے بھی واقفیت رکھتا ہو کیونکہ یہ نص قرآن اس کے پہلے مفسر یعنی بیان کرنے والے.. وہی ہیں چنانچہ قرآن میں ہے...وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس مانزل الیھم [۲] اورتمہارے پاس قرآن نازل کیا ہے تاکہ جو احکام لوگوں کے لئے نازل کئے گئے ہیں تم ان سے صاف صاف بیان کردو۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے۔ ھو الذی بعث فی الامّیین رسولا منھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ [۳] وہی تو ہے جس نے مکہ والوں میں ان ہی میں کا ایک رسول (محمدؐ) بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور انکے نفوس کو پاک کرتے اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتے ہیں۔

قرآن کی نظر میں خود رسول اسلامؐ اس کتاب کے مبین مفسر ہیں اور رسول اکرمؐ کے اقوال تفسیر قرآن میں بہت معین ومددگار ہیں، اور ہم چونکہ شیعہ ہیں اور ائمہ پر عقیدہ رکھتے ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کو جو چیزیں خدانے دی تھیں۔آنحضرتؐ نے اپنے اوصیاء کو منتقل فرمادیا ہے، اس لئے ائمہ معصومینؑ کی جو روایات معتبر ہیں ان کی حیثیت حدیث رسولؐ ہی کی طرح ہے اس لئے معصومینؑ کی حدیثیں بھی تفسیر میں بہت مددگار ہیں۔ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے تو قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنے کی کوشش کی جائے کیونکہ پورا قرآن ایک عمارت کی طرح ہے۔ اگر ہم صرف ایک آیت کو قرآن سے الگ کرکے یہ کہیں کہ ہم صرف اسی آیت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو یہ صحیح طریقہ نہیں ہے اگرچہ اسکا بھی امکان ہے کہ ہم نے اس ایک آیت کا مطلب جو سمجھا ہے وہ درست ہومگر یہ طریقہ بہرحال خلاف احتیاط ہے۔قرآن کی بعض آیتیں دوسری بعض آیتوں کی تفسیر کرتی ہیں۔[۴]

اور جیسا کہ بعض بزرگوں نے بھی فرمایا ہے کہ ائمہ معصومینؑ نے اس قسم کی تفسیر کی تائید فرمائی ہے۔ یعنی قرآن کی ایک آیت کو دوسری آیتوں کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرنا....قرآن بیان مسائل کے سلسلے میں اپنا مخصوص انداز رکھتا ہے۔ بہت سے ایسے مقامات ہیں کہ اگر ایک آیت کو لے

کر'' دوسری آیتوں کو دیکھے بغیر'' اسکے مفہوم کو دیکھا جائے اور پھر اسی قسم کی دوسری آیتوں کے پہلو میں رکھ کر اسی آیت کو دیکھا جائے تو دونوں مطلب میں بہت زیادہ فرق ہوجائے گا۔قرآن کا اپنا خود ایک مخصوص انداز ہے اس مفہوم کو ثابت کرنے کے لئے بطور نمونہ متشابہ ومحکم آیات کو پیش کیا جاسکتا ہے ۔محکم ومتشابہ آیات کے بارے میں ایک عوامی تصور یہ ہے کہ محکم آیات ان کو کہا جاتا ہے جن میں مطالب کو بہت واضح اور بالکل سیدھے طریقے سے بیان کیا گیا ہو۔ اور متشابہ ان آیات کو کہاجاتا ہے جن میں موضوعات کو بطور معمہ وپہیلی بیان کیا گیا ہو۔

اس تعریف کی بناء پر لوگوں کو یہ حق ہے کہ صرف محکم اور واضح آیتوں کے بارے میں غور کریں۔لیکن متشابہ آیتیں بنیادی طور سے شناخت کے قابل نہیں ہیں اور نہ ہی ان کے بارے میں غوروفکر کرنا چاہئے۔ اس وقت لازمی طور سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر متشابہ آیتوں کا فلسفہ کیا ہے؟ اور قرآن نے کیوں ایسی آیتوں کو پیش کیا ہے جو شناخت کے قابل نہیں ہیں؟

اس کا اجمالی جواب تو یہ ہے کہ نہ تو محکم کے معنی صریح وسادہ کے ہیں اور نہ متشابہ کا مطلب پہیلی ومعمہ ہے بلکہ معمہ اور رمز ایسی لفظیں ہیں جن کے معنی مبہم ومجمل ہوا کرتے ہیں اور ان کو ایسے کلمات سے بیان کیا جاتا ہے جس سے براہ راست معنی سمجھ میں نہیں آتے۔مثلاً جب فردوسی نے ناقابل برداشت زحمت کرکے شاہنامہ لکھا اور محمود غزنوی نے اس کے مقابلے میں بہت معمولی سی اجرت دینا چاہی جسے فردوسی نے قبول نہیں کیا اور شاہنامے کے آخر میں ہجو کے اشعار شامل کرلئے جس میں محمود کو بخیل وکنجوس کہا۔ ان ہجویات میں کچھ اشعار تو صریح ہیں لیکن کچھ بطور معمہ کہے گئے ہیں مثلاً ایک شعر یہ ہے۔

؎ اگر مادر شاہ بانو بدی.....مراسیم وزر تا بہ زانو بدی

یعنی اگر شاہ کی ماں شہزادی ہوتی تو شاہ مجھ کو سونے چاندی میں زانو تک غرق کردیتا۔ مطلب یہ ہے کہ شاہ کنیز زادہ ہے۔اس کنیز زادہ ہونے کو کنایۃً بیان کیا ہے۔اسی طرح ایک اور شعر ہے۔

کف شاہ محمود کشور کشائی نہ اندر نہ آمد سہ اندر چہار

فردوسی نے یہاں پر ایک معمہ سے استفادہ کیا ہے۔ پہلے آپ اس معمے کو سمجھیں اسکے بعد شعر سمجھ میں آئے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۳×۴=۱۲ اور ۹×۹=۸۱، ۸۱ اور ۱۲ کا مجموعہ ۹۳ ہوتا ہے۔ اب شعر کا مطلب یہ ہے کہ سلطان محمود کی مٹھی اس طرح مضبوطی کے ساتھ بند ہے کہ صرف

انگوٹھا کھلا ہوا ہے اور انگوٹھا وکلمہ کی انگلی باہم ۹ کی صورت اختیار کرلیتی ہے اور اس کے بعد کی تینوں انگلیوں کو ملایا جائے تو ۹۳ ہوجاتا ہے۔ اس شعر سے فردوسی محمود کی ضرورت سے زیادہ بخل کی نشاندہی کرتا ہے ۔اب آیئے دیکھیں کہ کیا قرآن میں بھی معمے والی آیتوں کا وجود ہے؟ یہ بات قرآن کی اس آیت کے مخالف ہے جہاں یہ کہاجارہا ہے کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو واضح ہے اور سب کے سمجھنے کے لائق ہے اس کی تمام آیتیں نور وہدایت ہیں۔ درحقیقت مطلب یہ ہے کہ قرآن میں بیان کئے گئے بعض مسائل (خصوصاً جہاں پر امورغیب اور ماورائے طبیعت کا بیان ہے) بنیادی طور پر الفاظ کے جامہ میں نہیں آسکتے۔ بقول شیخ شبستری:

؎ معانی ہرگز اندرحرف ناید... کہ بحربیکراں درظرف ناید..

معانی کسی طرح الفاظ کے اندرنہیں آسکتے جس طرح بحربیکراں کسی ظرف میں نہیں آسکتا۔

لیکن چونکہ قرآن کی زبان انسانوں کی زبان ہے اس لئے لطیف ومعنوی چیزوں کو مجبوراً ان عبارات والفاظ سے بیان کیا گیا ہے جن کو انسان مادی چیزوں کے لئے استعمال کرتا ہے۔لیکن غلط فہمی سے بچانے کے لئے بعض آیتوں میں مسائل کو اس طرح بیان کردیا گیا ہے کہ دوسری آیتوں کی مدد سے ان کی تفسیر کی جاسکے اور اس کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا اس لئے ایسے طریقے کار کو استعمال کیا گیا مثلاً ایک مسئلہ خدا کے دیکھنے کا ہے یعنی دل کی نگاہوں سے خدا کا دیدار ممکن ہے اس مطلب کو قرآن نے اس طرح ادا کیا ہے ۔ وجوہٌ یّومئذ ناضرۃ☆ الی ربھا ناظرۃ " ۵ اس روز بہت سے چہرے تو تر وتازہ بشاش ہوں گے (اور) اپنے پروردگار کی نعمت کو دیکھ رہے ہوں گے۔

اس جگہ پر قرآن نے دیکھنے (رویت) کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس سے مناسب تر (بظاہر) کوئی لفظ نہیں تھا۔لیکن اس لفظ (دیکھنے) سے اشتباہ ممکن تھا کہ لوگ سمجھیں گے خدا کو آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے اس لئے رفع اشتباہ کے لئے دوسری جگہ وضاحت کردی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: لاَتُدرِکُہُ الاَبصَارُ وَھُوَ یُدرک الاَبصَار۶ اس کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں (نہ دنیا میں نہ آخرت میں) اور وہ (لوگوں) کی نظروں کو خوب دیکھتا ہے۔

فطری طور سے ہر تلاوت کرنے والا دونوں آیتوں کو دیکھ سمجھ لے گا کہ تشابہ لفظی کے باوجود یہ امور باہم ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ قرآن اس بات کو روکنے کے لئے کہ کہیں وہ بلند و عالی معانی مادی معانی سے مشتبہ نہ ہوجائیں، اعلان کرتا ہے کہ متشابہات کو محکمات کی طرف پلٹاؤ۔ چنانچہ

ارشاد ہوتا ہے۔ هو الذی انزل علیک الکتاب منه آیات محکمات هن ام الکتاب ۔

وہی وہ خدا ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی اس میں بعض آیتیں تو محکم (بہت صریح) ہیں کہ وہی اصل وبنیاد ہیں۔ یعنی وہ آیتیں اتنی مستحکم ہیں کہ ان کو ان کے معانی سے خارج نہیں کیا جاسکتا اور نہ ان کے دوسرے معانی لئے جاسکتے ہیں، یہی ام الکتاب ہیں یعنی آیتوں کی ماں ہیں یعنی جس طرح بچہ ماں کی طرف رجوع کرتا ہے اور ماں بچہ کی مرجع ہے یا جس طرح بڑے شہر ام القریٰ چھوٹے شہروں کے مرجع ہوتے ہیں اسی طرح آیات محکمات متشابہ آیتوں کی مرجع ہیں۔ متشابہ آیتیں سمجھنے اور غور کرنے کے لئے ہیں لیکن ان میں غورفکر آیات محکمات کے سہارے سے کرنا چاہئے ۔ آیات محکمات کے سہارے کے بغیر متشابہ آیتوں کا جو مطلب اخذ کیا جائے گا وہ غیر معتبر ہوگا۔

کیا قرآن قابل شناخت ہے۔

قرآن کے مضامین کو سمجھنے کے لئے جو سوال سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا قرآن بنیادی طور سے قابل شناخت وقابل تحقیق ہے؟ یعنی کیا قرآن کے مطالب ومسائل غورفکر کے قابل ہیں یا یہ کہ اس کتاب کو سمجھنے کے لئے بھیجا ہی نہیں گیا اس کتاب کو صرف ثواب حاصل کرنے اور برکت حاصل کرنے کے لئے یا تلاوت کرنے کے لئے اتارا گیا ہے۔

یہاں پر ممکن ہے لوگوں کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ سوال بے محل ہے کیونکہ قرآن ایسی کتاب ہے جو شناخت ہی کے لئے ہے اس میں کسی شخص کو کوئی شبہ وتردید ہی نہیں..لیکن چونکہ اسلامی دنیا میں مختلف نا پسندیدہ اسباب کی بناپر قرآن کی شناخت کے سلسلے میں ایسے حالات رونما ہوئے ہیں کہ جنہوں نے مسلمانوں کے انحطاط میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے اور افسوس کے ساتھ ہمیں یہ کہنا پڑھا ہے کہ ایسے لچروپوچ وخطرناک افکار کی جڑیں ہمارے معاشرے میں اب بھی موجود ہیں ۔ ان کی بناپر ہم ضروری خیال کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں مزید وضاحت کریں۔

شیعہ علماء کے درمیان تین چار رصدی قبل کچھ ایسے افراد پیدا ہوئے تھے جنہیں ہم اخباری علماء کہتے ہیں۔ یہ حضرات قرآن کو حجت ہی نہیں مانتے تھے۔ علمائے اسلام کی طرف سے اسلامی مسائل کی شناخت کے لئے جو چار مصادر بطور معیار معین کئے گئے تھے (یعنی قرآن سنت، عقل ، اجماع) ان میں سے یہ اخباری علماء تین مصادر کو قبول ہی نہیں کرتے تھے، اجماع کو یہ کہہ کر رد کردیا

کرتے تھے کہ یہ تو سنیوں کی رسم ہے اور سنیوں کی پیروی نہیں کی جاسکتی ،عقل کے بارے میں کہتے تھے کہ اس کی طرف سے جو غلطیاں ہوتی ہیں ان پر اعتماد کرنا جائز نہیں ہے اور قرآن کے لئے کہتے ہیں کہ اللہ کی کتاب اس سے کہیں بلند وبرتر ہے کہ ہم جیسے حقیر لوگ اس کا مطالعہ کرسکیں یا اس میں غور کرسکیں۔ صرف پیغمبر اسلامؐ اور ائمہ کو یہ حق تھا کہ قرآنی آیات میں غور کرسکیں ہمیں صرف تلاوت کا حق ہے۔ لے دے کے ان حضرات کی نظروں میں سنت رسولؐ تھی آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ انہیں اخباری علماء میں سے بعض نے تفسیریں لکھی ہیں ان تفسیروں میں جہاں آیت قرآنی کے سلسلے میں کوئی حدیث ملتی تھی اس آیت کو لکھ کر نیچے حدیث لکھ دیتے تھے اور جس آیت کے بارے میں حدیث نہیں ہوتی تھی اس آیت کو لکھتے ہی نہیں تھے گویا وہ آیت قرآن کا جزو ہی نہیں ہے۔

یہ طریقہ کار قرآن پر ظلم کرنے کے مترادف تھا اور اسی سے یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ جس معاشرے میں کوئی آسمانی کتاب ہو اور وہ بھی قرآن جیسی اور پھر معاشرہ اسے پس پشت ڈال دے تو وہ معاشرہ ہرگز قرآن کے راستے پر نہیں چل سکتا۔ اخباریوں کے علاوہ بھی کچھ گروہ ایسے تھے جو قرآن کو عوام کی دسترس سے باہر جانتے تھے ۔ ان گروہوں میں اشاعرہ کا نام لیا جاسکتا ہے جو شناخت قرآن کا مطلب آیات قرآنی میں غوروفکر کرنے کو نہیں مانتے تھے بلکہ شناخت قرآن کا مطلب تحت اللفظی معانی کا جاننا قرار دیتے تھے یعنی قرآن کے ظاہری لفظ سے جو معنی سمجھ میں آتے ہیں انہی کو قبول کرلینا چاہئے۔ اس کے باطن سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہئیے یہ ان کا عقیدہ تھا۔ فطری بات ہے کہ قرآن کے ساتھ اس قسم کا معاملہ کرنا بہت جلد انحراف و گمراہی کا سبب بن گیا کیونکہ یہ لوگ بھی آیات کی توضیح کرنے پر مجبور تھے لیکن چونکہ عقل کو معطل کررکھا تھا، اس لئے قہری طور پر قرآن سے عوامی باتیں ہی سمجھتے تھے اور اسی طریقہ کار کی بناپر بہت جلد ، سیدھے راستے سے منحرف ہوجاتے اور غلط عقائد کے قائل ہوجاتے تھے مثلاً تجسم کا عقیدہ یعنی خدا جسم رکھتا ہے خدا کو آنکھوں سے دیکھنے کا عقیدہ ، بشری زبان سے خدا سے گفتگو کرنے کا عقیدہ اور اسی قسم کے دیگر باطل عقائد کے قائل ہوگئے تھے۔

ان لوگوں کے مقابلے میں جنہوں نے بنیادی طور سے قرآن چھوڑ رکھا تھا ۔ ایک دوسرا گروہ پیدا ہوگیا جس نے اپنے اغراض ومقاصد کو حاصل کرنے کے لئے قرآن کو ذریعہ بنالیا۔ جس طرح بھی ان کا مقصد پورا ہوتا ہو اسی طرح قرآنی آیتوں کی تاویل کرلیا کرتے تھے اور قرآن کی

طرف ایسے مسائل کو منسوب کر دیتے تھے جس سے روح قرآن واقف بھی نہیں تھی اور اسی کے ساتھ ہر اعتراض کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کرتے تھے کہ آیات کی باطنی تفسیر صرف ہم جانتے ہیں اور جو بات ہم کہہ رہے ہیں یہ باطن کو سمجھ کر ہی کہہ رہے ہیں۔

تاریخ اسلام میں اس قسم کے دو گروہوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

اول: اسماعیلہ (انہیں کو باطنیہ کہا جاتا ہے) دوم : صوفیہ۔ اسماعیل حضرات زیادہ تر تو ہندوستان میں ہیں لیکن تھوڑے بہت ایران میں بھی ہیں۔ ان لوگوں کی مصر میں ایک مدت تک حکومت بھی رہ چکی ہے جو فاطمی حکومت کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے۔اسماعیلی حضرات شیعوں کی اصطلاح میں ''شش امامی'' کہلاتے ہیں ،لیکن اس کے باوجود حتمی ویقینی طور سے اور تمام علماء شیعہ دوازدہ امامی کے اتفاق واجماع کی بناء پر یہ لوگ ''یعنی شش امامی'' ہر غیر شیعہ فرقہ کی بہ نسبت سب سے زیادہ شیعوں سے یہی حضرات دور ہیں ۔ انتہا یہ ہے کہ اہل سنت جو شیعوں کے کسی بھی امام سے اس طرح کی عقیدت نہیں رکھتے جیسے کہ شیعہ رکھتے ہیں اس کے باوجود بھی اہل سنت بہ نسبت شش امامی حضرات کے شیعوں سے نزدیک تر ہیں۔ ۸

اسماعیلیوں نے اپنی باطنی گری کا چکر چلا کر تاریخ اسلام میں بہت بڑی بڑی خیانتوں کے مرتکب ہوئے ہیں اور اسلامی مسائل میں ضرورت سے زیادہ انحراف پیدا کیا ہے۔اسماعیلیوں سے قطع نظر کرتے ہوئے صوفی فرقہ بھی آیات کی تحریف وتاویل کرنے میں اپنے شخصی عقائد کے پیش نظر کافی یدطولیٰ رکھتا ہے ۔ میں یہاں پر انکی تفسیروں میں سے صرف ایک تفسیر کا ذکر بطور نمونۂ کروں گا تا کہ ان کے طریقے واضح ہوجائیں اور ہمارے قاری حضرات اس اجمال سے تفصیل کا انداز لگائیں۔

قرآن نے جہاں پر حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بیٹے جناب اسماعیل کا قصبہ بیان کیا ہے وہاں اس طرح ذکر کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو چند بار اپنے بیٹے کے ذبح کرنے کا حکم خواب میں دیا گیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے پہلے تو تعجب کیا۔ لیکن جب کئی بار خواب میں یہی حکم ہوا تو انہیں یقین ہوگیا اور وہ پروردگار کا حکم بجا لانے پر آمادہ ہوگئے اور جناب اسماعیلؑ سے بھی صورتحال بیان کی تو اسماعیلؑ بھی خلوص دل کے ساتھ قربان ہونے کے لئے تیار ہوگئے ۔ اور خدا کا مقصد بھی یہی تھا کہ حکم خدا پر یہ حضرات راضی ہوجائیں اور یہی وجہ ہے کہ جب باپ بیٹے خلوص دل سے صفائی قلب کے ساتھ خدا کا حکم بجالانے کے لئے آمادہ ہوگئے تو خدا نے اس حکم کو روک دیا اور اس کے بدلے

میں فدیہ قرار دے دیا اس واقعہ کو صوفی حضرات کہتے ہیں کہ ابراہیمؑ سے مراد عقل ہے اور اسماعیلؑ سے مراد نفس، یعنی عقل کا ارادہ تھا کہ نفس کو ذبح کردے۔

ظاہر سی بات ہے کہ یہ قرآن کے ساتھ کھلواڑ اور ایک واضح قسم کا انحراف ہے اور اسی قسم کی بازی گری، حسب منشاء حسب مصلحت قرآن کا ترجمہ کردینے سے آنحضرتؐ نے یہ کہہ کر روکا تھا۔ من فسر القرآن برایة فلیتبوء مقعده فی النار جو شخص اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر بیان کرے اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ آیات قرآنی کے ساتھ اس قسم کی بازی گری قرآن کے ساتھ بہت بڑی خیانت ہے۔

قرآن مجید نے اخباریوں کے جمود وخشک فکری وغیرہ اور اسماعیلیوں وغیرہ کے انحرافات اور من مانی کرنے پر پابندی لگاتے ہوئے ایک بیچ کا راستہ پیش کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ منصفانہ اور بے غرضانہ فکر وتامل کو اختیار کرنا چاہئے۔ قرآن نے صرف مؤمنین ہی کو نہیں بلکہ مخالفین تک کو آیات قرآنی میں غوروفکر وتامل کی دعوت دی ہے کہ قرآن پر اعتراض کرنے کے بجائے اس کی آیتوں میں غوروفکر کرو۔ چنانچہ مخالفین کو خطاب کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: آخر یہ لوگ قرآن میں غوروفکر کیوں نہیں کرتے یہ کیسے دل ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ان پر مہر لگادی گئی ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: کتاب انزلنا ہ الیک مبارک لیدبروا آیاته ولیتذکر اولوا الالباب: ۹

(اے رسولؐ) یہ کتاب (قرآن) جو ہم نے تمہارے پاس نازل کی ہے (بڑی) برکت والی ہے (کیوں؟) تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں۔ یعنی اس کتاب کو اس لئے نہیں نازل کیا گیا ہے کہ اس کو چوم کر طاق پر رکھ دیں بلکہ اس لئے تارا گیا ہے کہ اس کی آیتوں میں غور کریں اور صاحبان عقل وخرد اس سے آگاہی حاصل کریں۔

یہ آیتیں اور ان کے علاوہ دسیوں وہ آیتیں جو قرآن میں غور کرنے کی تاکید کرتی ہیں سب کی سب تفسیر قرآن کے مجاز ہونے کی تائید کرتی ہیں لیکن وہ تفسیر جو میلان وخواہش نفس کی بناپر نہ ہو بلکہ انصاف وصداقت پر مبنی اور کسی خود غرضی ونفسانیت پر مبنی نہ ہو۔ جس وقت ہم خود غرضی ونفسانیت کے بغیر قرآن میں غور کریں گے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم قرآن کے تمام مسائل کا حل ڈھونڈ لیں، بلکہ اس اعتبار سے قرآن فطرت کے مشابہ ہے جس طرح فطرت کے بہت سے راز ابھی تک حل نہیں ہوسکے اور موجودہ زمانے میں بھی ان کے حل کا امکان نہیں ہے (اسی طرح قرآن کو بھی سمجھنا چاہئے) ہاں ممکن ہے یہ مسائل مستقبل میں حل ہوجائیں، اس کے علاوہ

انسانی طبیعت کی شناخت میں اپنے افکار کو فطری تقاضوں کے مطابق کرنا چاہئے نہ کہ طبیعت وفطرت کی توجیہ وتفسیر اپنی رائے کے مطابق کرے اسی طرح قرآن بھی طبیعت کی طرح ایک کتاب ہے جو کسی ایک زمانے کے لئے نازل نہیں ہوئی اور اگر قرآن کسی ایک زمانے کے لئے ہوتا تو اب تک اس کے تمام رازوں سے پردہ اٹھ چکا ہوتا۔ اور اس آسمانی کتاب کی جاذبیت، تازگی اور اثر اندازی ختم ہوچکی ہوتی۔ لیکن صورتحال اس کے برخلاف ہے۔ تدبر وتفکر سے ہمیشہ قرآن کے لئے کشف جدید ہے اور اسی نکتہ کی رسولؐ وآل رسول نے توضیح فرمائی ہے۔ ایک حدیث نبوی میں ہے: قرآن چاند وسورج کی طرح ہے جس طرح وہ دونوں ہمیشہ حرکت میں ہیں یعنی ایک جگہ ثابت وگڑے ہوئے نہیں ہیں (اسی طرح قرآن کے تدبر سے نئے نئے معانی ظاہر ہوتے ہیں: مترجم)اسی طرح رسولؐ کا ارشاد ہے: قرآن کا ظاہر بہت خوبصورت اور باطن گہرا ہے، کتاب عیون اخبار رضا میں امام رضاؑ سے نقل کیا گیا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے لوگوں نے پوچھا: اس کی کیا وجہ ہے کہ قرآن پر جتنا زمانہ گزرتا جاتا ہے اور جتنی زیادہ اس کی تلاوت ہوتی ہے اس کی تازگی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ امامؑ نے فرمایا: قرآن کسی ایک زمانے اور کچھ لوگوں کے لئے نازل نہیں کیا گیا بلکہ تمام زمانوں اور تمام لوگوں کے لئے نازل کیا گیا ہے۔ قرآن کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ ہر زمانے میں تمام ان اختلافات کے باوجود جو طرز تفکر، معلومات، وسعت افکار میں دکھائی دیتے ہیں، پھر قرآن تمام زمانوں اور تمام افکار پر فوقیت رکھتا ہے اور اسی کے ساتھ تلاوت کرنے والوں کے لئے بہت سے مجہولات رکھنے کے باوجود اتنے زیادہ معانی ومفاہیم قابل ادراک پیش کرتا ہے کہ جس سے ظرف زمان مملو ہوجاتا ہے۔

تجزیاتی شناخت قرآن

اس حصے میں میں قرآن کے مضامین کی تحقیق کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ اگر قرآن کے ایک ایک موضوع کو بیان کرنا چاہوں تو اس کے لئے ستر من کاغذ کی ضرورت ہوگی، اس لئے پہلے میں کلیات کو پیش کروں گا، اس کے بعد بعض جزئیات کا بھی ذکر کروں گا۔ قرآن نے بہت سے مطالب سے بحث کی ہے اور اس سلسلے میں بعض مطالب پر زیادہ تکیہ کیا ہے اور بعض پر کم، جو مسائل قرآن میں بیان کئے گئے ہیں ان میں خداوندعالم اور کائنات کے مسائل زیادہ ہیں۔ اب آیئے یہ دیکھیں کہ

قرآن خدا کی معرفت کس طرح کرتا ہے کیا یہ معرفت بعنوان فلسفیانہ ہے یا بطور عرفان؟ اسی طرح کیا یہ دیگر مذہبی کتابوں، توریت وانجیل کی طرح ہے یا مکاتب ہندی کی شکل وصورت میں ہے؟ یا یہ خدا کی معرفت میں بالکل مستقل طریقہ کو اختیار کرتا ہے اس میں کسی کی تقلید نہیں کرتا۔

ایک مسئلہ قرآن میں دنیا کا ہے۔ اس میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کائنات کے بارے میں قرآن کا کیا نظریہ ہے؟ آیا خلقت وکائنات کو عبث وبازیچۂ اطفال جانتا ہے یا اسے برحق سمجھتا ہے؟ آیا کائنات کو ایک سلسلۂ کائنات کو ایک سنن ونوامیس وعلل ومعلول جانتا ہے؟ یا اسے بے قاعدہ وبیہودہ شمار کرتا ہے یعنی کوئی چیز کسی چیز کے لئے شرط نہیں ہے۔

اسی طرح قرآن میں بطورکلی ایک مسئلہ انسان کا پیش کیا گیا ہے۔ انسان کے سلسلے میں قرآنی نظریہ کیا ہے۔ یہ بات بھی تحلیل کے قابل ہے کہ آیا قرآن انسان کے بارے میں مثبت نظریہ رکھتا ہے یا منفی؟ اور انسان کو حقیر سمجھتا ہے یا اس کی عظمت وکرامت کا قائل ہے؟

ایک دوسرا مسئلہ انسانی معاشرے کا بھی ہے کہ آیا قرآن انسانی معاشرہ کی اصالت و شخصیت کا قائل ہے یا اس کی نظر میں معاشرہ کچھ بھی نہیں اصالت صرف افراد کو حاصل ہے؟ اور آیا قرآنی نظریہ زندگی، موت، ترقی تنزلی کے بارے میں یہ ہے کہ یہ چیزیں درحقیقت معاشرے کی صفات ہیں یا صرف افراد کی صفات ہیں؟ اسی جگہ سے تاریخ کا بھی مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور یہ کہ تاریخ کے بارے میں قرآنی نظریہ کیا ہے؟ تاریخ کی محرک طاقتیں قرآن کی نظر میں کون ہیں؟ اور فرد تاریخ میں کس قدر مؤثر واقع ہوا ہے۔ان کے علاوہ بہت سے دوسرے مسائل بھی قرآن میں پیش کئے گئے ہیں، سردست بطور فہرست چند مسائل کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے منجملہ ان مسائل کے ایک یہ ہے کہ خود اپنے بارے میں قرآن کا کیا نظریہ ہے؟ اس کے بعد قرآن میں پیغمبرؐ کا مسئلہ ہے اور یہ کہ قرآن پیغمبرؐ کا تعارف کس طرح کراتا ہے۔ پیغمبرؐ کے ساتھ کیسی گفتگو کرتا ہے۔اس کے علاوہ دوسرا مسئلہ قرآن میں مومن کی کیا تعریف ہے اور مومنین کے کیا صفات ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ان مباحث میں ہر بحث کے بہت سے شعبے ہیں، مثلاً جب ہم انسان کے بارے میں بحث کریں گے تو فطری طور پر اخلاق کے بارے میں بھی بحث کرنی ہوگی یا جس وقت معاشرے کے بارے میں بحث ہوگی تو قہری طور سے روابط افراد، مسئلہ امر بہ معروف ونہی از منکر اجتماعی طبقات وغیرہ کے بارے میں بحث کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

قرآن اپنے لئے کیا کہتا ہے؟

قرآن کے مضامین کی تحلیل کے سلسلے میں سب سے بہتر طریقہ کار یہ ہے کہ ہم پہلے قرآن ہی کو دیکھیں کہ اپنے بارے میں اس کا کیا نظریہ ہے ؟اور وہ خود کو کس طرح پیچنوا تا ہے؟ سب سے پہلی بات جو قرآن اپنے بارے میں کہتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے تمام کلمات اور اس کی تمام عبارتیں خدا کا کلام ہیں۔قرآن صریحی طور سے کہتا ہے کہ یہ پیغمبرؐ اسلام کا کلام نہیں ہے بلکہ پیغمبرؐ تو صرف ان ہی چیزوں کو بیان کرتے ہیں جو ان پر روح القدس یا جبرائیل کے ذریعے نازل ہوتی ہیں۔ دوسری وضاحت جو قرآن اپنے بارے میں کرتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن لوگوں کی ہدایت کرنے والا اور ان کو تاریکی سے نور کی طرف لانے والا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے : کتاب انزلناہ الیک لتخرج الناس من الظلمت الی النور [۱۰]

اے رسول ! یہ قرآن وہ کتاب ہے جس کو ہم نے تمہارے پاس اس لئے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو (کفر کی) تاریکی سے (ایمان کی) روشنی میں نکال لاؤ۔

یقیناً ان تاریکیوں کے مصادیق میں سے ایک مصداق جہالت ونادانی بھی ہے۔قرآن بشر کو اس تاریکی سے علم کی طرف لاتا ہے لیکن اگر تاریکیاں صرف نادانی کا نام ہوتا تو فلسفی حضرات بھی یہ کام کرسکتے تھے،لیکن دنیا میں ظلمت نادانی سے زیادہ خطرناک ظلمتیں موجود ہیں جن کا مقابلہ علم کی طاقت سے باہر ہے مثلاً منفعت پرستی،خود پرستی،خواہشات کی پیروی وغلامی وغیرہ ایسی تاریکیاں ہیں جوافرادی واخلاقی تاریکیوں میں شمار ہوتی ہیں۔ اجتماعی تاریکی کی مثال ظلم وستم وغیرہ سے دی جاسکتی ہے اورعربی زبان میں لفظ ظلم مادۂ ظلمت ہی سے ماخوذ ہے جو اجتماعی اور معنوی تاریکی کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان تاریکیوں کا مقابلہ کرنا قرآن اور دیگر آسمانی کتابوں کا کام ہے۔قرآن جناب موسیٰؑ سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے۔:....ان اخرج قومک من الظلمات الی النور [۱۱] اور ہم نے موسیٰ کوحکم دیا کہ اپنی قوم کو (کفر کی) تاریکیوں سے (ایمان کی) روشنی میں نکال لائیں۔

اس تاریکی سے مراد وہی فرعون فرعونیوں کا ظلم وستم ہے اورنور سے مراد نور آزادی وعدالت ہے۔اہل تفسیر نے ایک نکتہ یہاں پر بیان کیا ہے کہ قرآن نے ہمیشہ الظلمات کہا ہے یعنی جمع محلیٰ بالف ولام استعمال کیا ہے جو استغراق پر دلالت کرتا ہے اورتمام تاریکیوں پر محیط ہے اس کے برخلاف

لفظ نور کو ہمیشہ مفرد استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے صراط مستقیم صرف ایک ہے لیکن انحراف وگمراہی متعدد ہیں ۱۲؎ اس طرح قرآن اپنے مقصد کو معین کرتا ہے کہ اس کا ہدف یہ ہے : تمام جہالت وگمراہی اور اجتماعی واخلاقی ستم وتباہی کی زنجیروں کو توڑنا ! جس کو ایک کلمہ میں اس طرح کہا جاسکتا ہے تاریکیوں کو ختم کرکے عدل وخیر، روشنی ونور کی طرف ہدایت کرنا۔

عربی زبان کا علم

ایک دوسرا مسئلہ قرآن کی زبان یعنی عربی کا علم اور اس کی تلاوت کا بھی ہے کچھ لوگوں کا کہنا ہے ہ تلاوت قرآن کا مطلب صرف ثواب کے لئے اس کے حروف کی تکرار وتلاوت کرنا ہے جس میں معنی کے سمجھنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ قرآن کی تلاوت کرتے رہتے ہیں لیکن اگر ایک مرتبہ بھی ان سے پوچھ لیا جائے کہ جو آپ تلاوت کرتے ہیں کیا اس کا مطلب بھی جانتے ہیں ؟ تو یہ جواب دینے سے عاجز رہ جاتے ہیں ۔قرآن کی تلاوت اس اعتبار سے کہ معانی قرآن سمجھنے کا مقدمہ ہے یہ بہت اچھی بات ہے لیکن صرف ثواب کی نیت سے پڑھنا کافی نہیں ہے۔

روایات متواترہ سے ثابت ہے کہ صرف تلاوت کا بھی ثواب ہے چاہے معنی نہ سمجھے، ہاں اگر معنی بھی سمجھتا ہوتو نور علی نور ہے (مترجم)

قرآن کے معنی سمجھنا بھی خصوصیات کا حامل ہے اس کی طرف بھی توجہ رکھنی چاہئے۔ بہت سی کتابوں کو یاد کرنے کے لئے پڑھنے والے کو جو بات حاصل ہوتی ہے وہ تازہ افکار کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جو قاری کے ذہن میں پہلے سے موجود نہیں رہتا بلکہ پڑھنے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔یہاں صرف پڑھنے والے کی عقل اور قوت فکر ہی ہے جو فعالیت میں مشغول ہوتی ہے ، لیکن قرآن کے سلسلے میں بغیر کسی شک وشبہ کے یہ بات طے ہے کہ اس کو سیکھنے اور سکھانے کے لئے پڑھنا چاہئے اور خود قرآن نے بھی یہی بات کہی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :کتاب انزلنا ہ الیک مبارک لیدبروا آیاته ولیتذکر اُولُو الاَلبَاب ۱۳؎ اس کا ترجمہ گذشتہ صفحے پر گزر چکا ہے۔

قرآن کا ایک فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ تعلیم دے اور اس سلسلے میں قرآن کا تخاطب عقل سے ہے اور قرآن عقل سے منطق واستدلال کے ذریعے گفتگو کرتا ہے ۔ البتہ ایک بات اور ہے قرآن کے پاس ایک دوسری زبان بھی ہے جس کا مخاطب دل ہے اس دوسری زبان کا نام احساس ہے۔ اگر کوئی

شخص قرآن سے آگاہی حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس سے مانوس ہونا چاہتا ہے تو اس کو ان دونوں زبانوں سے واقف ہونا ضروری ہے اور دونوں سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔ ان دونوں میں جدائی ڈالنے کا نتیجہ اشتباہ وخطا اور گھاٹے کے علاوہ کچھ نہ ہوگا۔

ہم جس چیز کو دل کہہ رہے ہیں اس سے ہماری مراد بہت ہی عظیم وعمیق احساس ہے جو انسان کے باطن میں موجود ہیں جس کی تعبیر کبھی احساس ہستی سے بھی کی جاتی ہے یعنی انسان کا وہ احساس جو ہستی مطلق سے ارتباط رکھتا ہے، جو شخص دل کی زبان کو جانتا ہے اور اس زبان سے انسان کو مخاطب کرتا ہے وہ اس کو ہستی کی گہرائی اور اس کے وجود کی حقیقت سے باہر لاتا ہے اور پھر اس وقت صرف انسان کا دماغ اور اس کی فکر ہی متاثر نہیں ہوتی بلکہ اس کا پورا وجود متاثر ہوتا ہے بطور نمونہ احساس کی زبان کو موسیقی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ موسیقی کی تمام قسمیں اپنے پورے اختلاف کے باوجود ایک چیز میں سب ہی مشترک ہیں اور وہ انسانی احساسات وجذبات کو متاثر کرنا ہے۔ موسیقی انسان کی روح میں ہیجان پیدا کردیتی ہے اور اس کو احساس کی ایک مخصوص دنیا میں پہنچادیتی ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ موسیقی کے اختلاف سے جذبات واحساسات میں بھی فرق پڑجاتا ہے۔ آپ نے میدان جنگ میں دیکھا ہوگا کہ جب فوجی باجہ بجنے لگتا ہے تو کبھی کبھی اس کا اثر اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ جو فوجی دشمن کے ڈر سے اپنے ٹھکانے سے باہر آتے ہوئے ڈرتا ہے وہ فوجی ترانے کو سن کر دشمن کے مسلسل حملوں کے باوجود اپنے مورچے سے باہر آکر بڑی دلیری سے پیش قدمی کرنے لگتا ہے۔

اسی موسیقی کی ایک دوسری قسم ہوتی ہے جو انسان کے شہوت کر بھڑکادیتی ہے اور انسان کو اتنا سست وبیخود بنادیتی ہے کہ وہ شہوت کے ہاتھوں بدکاری پر آمادہ ہوجاتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس سلسلے میں موسیقی جتنا انسانی جذبات کو ابھارتی ہے دنیا کی کوئی شئے نہیں ابھارتی تو شاید غلط نہ ہو جب محفل رقص وسرور جوش پر آجاتی ہے تو انسان اپنی عفت وعصمت کی دیوار کو توڑ دیتا ہے۔ تمام احساسات کو اسی کی زبان سے ابھارا جاسکتا ہے خواہ وہ موسیقی ہو یا کوئی اور چیز اس سے احساسات پر کنٹرول بھی کیا جاسکتا ہے۔ مشرق ومغرب میں اس حس دینی کے بارے میں بہت سی باتیں کہی گئی ہیں ہم دنیا کے مفکرین میں سے صرف ایک دو کی رائے کو یہاں ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے تو اس سلسلے میں آنسٹائن کا نام لیا جاسکتا ہے، اس نے اپنے ایک مقالے میں مذہب کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔ میرے نظریہ کے مطابق دنیا میں بطور کلی تین قسم کے مذاہب کا وجود ہے۔

۱۔ ترس وخوف کا مذہب یعنی ! ان لوگوں کا مذہب جنہیں مذہب کی طرف ابھارنے والی چیز فطرت کا ایک ڈراؤنا سلسلہ ہے جو اس کائنات میں ہے۔

۲۔ مذہب اخلاق : اس سے مراد وہ مذہب ہے جس کی بنیادیں اخلاقی مصالح پر استوار کی گئی ہوں۔اس کے بعد آنسٹائن نے ایک مذہب کا ذکر کیا ہے اور اس کا نام ''مذہب ہستی'' رکھا ہے موصوف کی اس تعبیر کا مطلب وہی ہے جس کو ہم نے ''دل'' کہا ہے۔آنسٹائن کا نظریہ اس مذہب کے بارے میں یہ ہے : انسان پر ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے جس میں انسان کی معنوی وروحانی حالت اجاگر ہوجائے گی اور اس حالت میں اپنی حقیر وبے معنی آرزؤں اور امیدوں میں گھرا ہوا اور محدود ومقید کیا ہوا ، دوسروں سے الگ تھلگ رہنے والا، اسی طرح اپنے اس عالم ہستی طبیعی میں محصور انسان دفعتہً اپنی اس قید وبند کے زنجیروں سے باہر آجائے گا۔اور اس زندان سے چھوٹ جائے گا اور اس وقت کل ہستی کے نظارے میں مشغول ہوجائے گا اور وجود کو مثل ایک حقیقت واحدہ کے پائے گا۔اور مابعد الطبیعات کے شکوہ وعظمت وجلال کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا اور اس وقت اپنی حقارت وناچیزی کو یاد کرے گا اور چاہے گا کہ کل ہستی سے متصل ہوجائے ۔

آنسٹائن کی یہ تعبیر ہمام کی داستان کو یاددلاتی ہے کہ ہمام حضرت امیر المومنین علیؑ ابن طالبؑ سے مومن کی صفات پوچھ رہے تھے تو حضرت علیؑ نے ان کے جواب میں ایک ایسی بات کہی جوتھی تو بہت مختصر لیکن بہت ہی جامع اور مکمل ! فرماتے ہیں: یاھمام اتق اللہ واحسن ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون ، (نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۳)''اے ہمام تم خود اپنے خداسے ڈرو اور نیکوکاربن جاؤ کیونکہ خدا نیک اور پرہیزگار بندوں کے ساتھ ہے'' لیکن ہمام صرف اتنے مختصر سے جوابط پر راضی نہیں ہوتے اور چاہتے ہیں کہ حضرتؑ سے ان کے شب وروز ، معاشرت وطرز عبادت وطریقہ زندگی کو بھی معلوم کریں اس لئے سوال کرتے ہیں تو پھر حضرت علیؑ صفات مومن بیان فرماتے ہیں اور تقریباً ۱۳۰ صفتیں بیان فرماتے ہیں منجملہ ان کے یہ ہے : لولا الا جال التی کتب اللہ لھم لم تستقر ارواحھم فی ابدانھم طرفہ عین ، اگر خدا کی طرف سے معین کردہ موت کی مدت نہ ہوتی تو چشم زدن کے برابر بھی ان کی روحیں ان کے بدنوں میں نہ ٹھہرتیں۔ یہ وہی حالت ہے جس کی طرف آنسٹائن اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے : مذہبی انسان اپنے وجود کو ایک قسم کا قید خانہ خیال کرتا ہے اور اس کا جی چاہتا ہے کہ پنجرہ جسم سے پروانہ کرجائے اور تمام ہستی کو یکبارگی فوراً بہ آن واحد پالے۔

حضرت علیؑ نے اس حقیقت کو بہت زیادہ جامع بزرگ اور شدید ترصورت میں بیان کیا ہے۔ حضرت علیؑ کے نظریے کے مطابق مردمومن اپنی پوری ہستی کو اپنے مادی بدن کے اندر جمع کئے ہوئے ہے اور یہی وجہ ہے کہ ناگہانی طور پر اپنے جسم کو چھوڑ کر اپنی روح کو آزاد کرلیتا ہے۔ ہمام کے قصہ میں لکھا ہے کہ جب حضرت علیؑ کی گفتگو ختم ہوئی تو ہمام کی روح بھی قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

انسان کی حِس معنوی کے بارے میں اقبال نے بھی بڑی اچھی بات کہی ہے وہ کہتے ہیں یہ بات بہت واضح ہے کہ دعا وپرستش ایک اشراقی نفسانی کے عنوان سے ایک حیاتی اور متعارف عمل ہے کہ اس چھوٹے سے جزیرے کے طفیل ہماری شخصیت اپنی وضعیت کا ایک ایسے کل میں اکتشاف کرتی ہے جو حیات سے بزرگ تر ہے۔ ویلیم جیمز نے بھی اسی سلسلے میں ایک بات کہی ہے: پرستش کی تڑپ اس امر کا ضروری نتیجہ ہے کہ ہر شخص کے خود اختیاری عمل کا عمیق ترین حصہ ہونے کے باوجود ایک قسم کی اجتماع خودی بھی ہے جو ان تمام مصیبتوں کے باوجود اپنے کو دنیائے فکر کے اندر تلاش کرسکتی ہے زیادہ تر لوگ خواہ مسلسل یا اتفاقی طورسے دل ہی دل میں اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ روئے زمین کی حقیر ترین فرد اس بلند وبرتر توجہ کے ساتھ اپنے کو ایدک واقعی وقیمتی احساس کرتی ہے (یہ بھی) احتمال ہے کہ لوگ تاثیر پذیری کے درجے کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔ بعض لوگوں کے لئے دوسروں سے زیادہ یہی توجہ خود آگاہی کی بنیادی قسمت کی تشکیل کرتی ہے۔ اور ایسے لوگ متدین تر ہیں لیکن میں اطمینان رکھتاہوں کہ وہ لوگ جن میں اس احساس کا فقدان ہے وہ لوگ اپنے کوفریب دیتے ہیں اور واقعاً وہ بھی کسی نہ کسی حدتک ایمان رکھتے ہیں۔

ہر انسان کے جذبات واحساسات میں ایک حس مذہبی وخدا کی تلاش ہے اورقرآن عظیم و شریف حس سے بھرپور تعلق رکھتا ہے۔ قرآن نے خود تعلیم دی ہے کہ قرآن کو خوش الحانی سے پڑھا کرو۔ اور یہ وہی آسمانی صدا ہے کہ قرآن اپنی فطرت الٰہی کی بناء پر انسان سے گفتگو کرتا ہے اور اسے مسخر کرلیتا ہے۔ [۱۴] قرآن اپنی توصیف کے لئے دوزبان کا قائل ہے، کبھی تو اس نے اپنے کو کتاب تفکر منطق کہا ہے اور کبھی اپنا تعارف کتاب احساس وعشق کے ذریعے کرایا ہے۔ یعنی یوں سمجھئے کہ قرآن صرف عقل وفکر کے لئے غذا نہیں مہیا کرتا بلکہ روح کے لئے بھی غذا فراہم کرتا ہے قرآن اپنی مخصوص موسیقی کے لئے بہت تاکید کرتا ہے جس موسیقی کا اثر انسان کے عمیق وبلند احساسات کو تمام موسیقوں سے زیادہ ابھارتا ہے، خود قرآن اس موسیقی کی تعلیم مومنین کو دیتا ہے تاکہ رات کے کچھ حصے

تک مومنین تلاوت قرآن میں مشغول رہیں اور اپنی نمازوں میں خدا کی طرف توجہ رکھتے ہوئے قرآن کی تلاوت کریں۔

رسول اکرمؐ کو قرآن مخاطب کرکے کہتا ہے: یا ایھا المزمل☆ قم اللیل الا قلیلا ☆ نصفه وانقص منه قلیلا☆ اوزد علیه الخ: ۱۵

اے کملی اوڑھنے والے(رسولؐ) راتوں کو (عبادت کے لئے) کھڑے رہا کرو مگر کم سے کم آدھی رات یا کچھ زیادہ اور قرآن کو ترتیل سے پڑھا کرو۔ ترتیل کا مطلب یہ ہے کہ اتنی جلدی جلدی نہ پڑھو کہ الفاظ ہی سمجھ میں نہ آئیں او رنہ اتنی سست رفتاری سے پڑھو کہ باہم الفاظ کا رابطہ ہی ٹوٹ جائے۔ یعنی آہستہ وسکون کے ساتھ آیتوں کے معانی پر غور کرتے ہوئے پڑھو۔ پھر اسی سورہ میں بعد کی آیات میں ارشاد ہوتا ہے۔ اگر روزانہ کے کاموں کے لئے مثلاً تجارت جہاد وغیرہ کے لئے زیادہ آرام کی ضرورت ہوتو بھی خلوت میں یاد خدا اور عبادت خدا سے غافل نہ ہو۔

مسلمانوں کے درمیان جو چیز مایۂ نشاط اور قدرت روح اور خلوص وصفائے باطن پیدا کرنے کی تھی وہ صرف قرآن کی موسیقی تھی۔ قرآن کی آسمانی آواز نے بہت ہی مختصر سی مدت کے اندر جزیرۃ العرب کے وحشی لوگوں کو ایسا ثابت قدم مومن بنادیا جنہوں نے اپنے زمانہ کی بڑی بڑی طاقتوں کے چھکے چھڑادیے اور انکو شرمناک شکست دی۔ اس زمانہ کے مسلمان قرآن کو صرف ایک ایسی کتاب درس وتدریس ہی نہیں سمجھتے تھے جو غذائے روح اور اضافہ طاقت وزیادتی ایمان کا سبب ہو۔ بلکہ راتوں کو بڑے خلوص کے ساتھ تلاوت کیا کرتے تھے۔ ۱۶ راتوں کو اپنے خدا سے رازونیاز کرتے تھے۔ اور دن کو شیر نر کی مانند دشمنوں پر حملہ کرتے تھے قرآن بھی مومنین سے اسی چیز کی توقع رکھتا تھا چنانچہ خدا رسولؐ خدا سے خطاب کرکے کہتا ہے :فلاتطع الکفرین وجاھد ھم به جھاداً کبیراً ۱۷ کافروں کی باتوں کو نہ سینے ان سے زبردست طریقہ سے جنگ کیجئے۔ اور پیغمبرؐ کی پوری زندگی اس قول کی سچائی کی تصدیق کرتی ہے۔ پیغمبرؐ کا جب کوئی مددگار نہ تھا اس وقت بھی آپ تن تنہا قرآن کو ہاتھ میں لے کر قیام کرتے تھے اور یہی قرآن آپؐ کے لئے سب کچھ تھا۔ یہی قرآن رسولؐ کے لئے فدائی پیدا کرتا تھا۔ اسلحہ جنگ مہیا کرتا تھا اکٹھا کرتا تھا۔ دشمن کو آپؐ کے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور کرتا تھا۔ دشمنوں کو آپ کی طرف کھینچ کرلاتا تھا اور ان کو رسولؐ کے سامنے سرتسلیم خم کرنے پر مجبور کرتا تھا اور اس طرح کے وعدہ کی صداقت کا اثبات کرتا تھا۔ ۱۸

جب قرآن اپنی زبان کو دل کی زبان کہتا ہے تو اس سے مراد وہ دل ہوتے ہیں جو آیات خدا سے اپنے اوپر صیقل کرنا چاہتے ہیں اور اپنی صفائی کرنا چاہتے ہیں، اور یہ زبان موسیقی کی زبان کے علاوہ ہے کیونکہ موسیقی کی زبان کبھی کبھی انسان کے شہوانی جذبات کو بھی ابھاردیتی ہے اور فوجی زبان وجنگی زبان کے بھی علاوہ ہے کیونکہ جنگی زبان سے صرف حس شجاعت ابھارتے ہیں یہ وہ زبان ہے جو بدّ وعرب میں سے ایسے مجاہد پیدا کردیتی ہے جن کے بارے میں کہا گیا ہے: حملوا بصائرهم على اسيافهم۔ایسے لوگ جنہوں نے اپنی پہچان ، اپنی بینائی اپنے روشن افکار، الٰہی معلومات اور اپنی معنویت کو اپنی تلواروں پر رکھ دیا تھا اور جن کی تلواریں اسی آیئڈیا وافکار پر کام کرتی تھیں۔

ان لوگوں کی نظر میں فردی مسائل اور شخصی منافع کبھی نہیں تھے حالانکہ یہ لوگ معصوم نہیں تھے بلکہ خطا کار تھے لیکن قائم اللیل اور صائم النہار رات بھر عبادت کرنے والے اور دنوں کو روز ہ رکھنے والے کے سچے مصدق تھے۔ ہر وقت ہستی کی گہرائیوں کے بارے میں سوچا کرتے تھے۔ راتوں کو عبادت کرتے تھے ۔دنوں کی جہاد میں مشغول رہتے تھے ۔

قرآن اپنی اسی خاصیت کی وجہ سے دل وروح کی کتاب ہے، ایسی کتاب ہے جس سے روح میں تڑپ پیدا ہوتی ہے ، آنکھوں سے اشک جاری ہونے لگتے ہیں ، دلوں میں کپکپی پیدا ہوجاتی ہے۔قرآن ایک اور گروہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب ان کے سامنے آیات قرآنی کی تلاوت کی جاتی ہے تو ان پر خضوع وخشوع کا عالم طاری ہوجاتا ہے اور وہ کہتے ہیں جو کچھ اس کتاب میں ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں کیونکہ یہ سب کا سب حق ہے یہ کہتے ہیں اور ان کے خضوع میں اور اضافہ ہوجاتا ہے۔

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ اہل کتاب میں سے عیسائی مسلمانوں سے بہت قریب ہیں اور یہودی ومشرکین بہت دور ہیں چنانچہ ارشاد ہے: لتجدن اشد الناس عداوة للذين آمنوا اليهود والذين اشركوا ولتجدن اقربهم مودة للذين آمنوا الذين قالوا انا نصارىٰ [۱۹]

اے میرے رسولؐ لوگوں میں مسلمانوں کے سب سے زیادہ دشمن یہودی اور مشرکین ہیں اور مومنین سے ازروئے محبت سب سے زیادہ نزدیک وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔

اس کے بعد عیسائیوں کے ایک گروہ کی توصیف بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ یہ قرآن کو سنتے ہیں ایمان لاتے ہیں جیسا کہ ارشاد ہے:واذا سمعوا ماانزل الى الرسول ترىٰ

اعینهم تفیض من الدمع مماعرفوا من الحق یقولون ربنا امنا فاکتبنا مع الشاهدین۲۰
جب یہ لوگ رسولؐ پر نازل شدہ آیتوں کو سنتے ہیں تو تم دیکھو گے کہ حق کے پہچاننے کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے اشک جاری ہوجاتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ پروردگارا ہم ایمان لائے ہمیں بھی اپنے پیغمبرؐ کے سچے گواہوں میں قرار دے۔

دوسری جگہ پر جہاں براہ راست مومنین سے خطاب کیا جارہا ہے ان لوگوں کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے : الله نزل احسن الحدیث کتابا متشابها مثانی تقشعر منه جلود الذین یخشون ربهم ثم تلین جلودهم وقلوبهم الی ذکر الله۔۲۱

یعنی خدانے بہترین کلام کو نازل فرمایا، ایسا کلام جو سراسر ایک ہے اور ایک دوسرے کے مشابہ ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ صرف بشارت نہیں ہے بلکہ نصیحت بھی ہے۔ خدا پرست وخداترس لوگ جب کلمات خدا کو سنتے ہیں تو ان کے جسموں میں کپکپی پیداہوجاتی ہے اور ان پر خوف طاری ہوجاتا ہے اور اس وقت ان کی حالت پر یاد خدا سکون اور محبت کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔

ان آیات میں اور ان کے علاوہ دوسری آیتوں ۲۲ میں قرآن اس بات کی بھی وضاحت کرتاہے کہ یہ محض علمی وتحلیلی کتاب نہیں ہے بلکہ جس طرح یہ منطقی استدلال سے پر ہے، اسی طرح انسان کے احساس وذوق اور لطائف روح سے بھی پر ہے اور انسان کی روح کو متاثر کرتی ہے۔

حوالے:

۱۔سورہ الحاقہ آیت ۴۴ تا ۴۶
۲۔سورہ نحل،آیت ۴۴
۳۔سورہ جمعہ،آیت ۲
۴۔ان القرآن یفسر بعضه بعضا
۵۔سورہ قیامہ، آیت ۲۲، ۲۳
۶۔سورہ انعام، آیت ۱۰۳
۷۔سورہ آل عمران،آیت ۷
۸۔ایک کانفرنس ''اسلامی مذاہب میں نزدیکی کیسے کی جائے؟'' کے عنوان پر ۳۵ سال قبل تشکیل دی گئی تھی اور اس میں تمام مذاہب کے افراد غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے کچھ حضرات فرقہ اسماعیلیہ کی نمائندگی کرنے کے لئے آئے تھے لیکن وہاں سنیوں اور شیعوں نے بالاتفاق یہ کہہ کر کہ ''ہم لوگ آپ حضرات

کو اسلامی فرقوں میں شمار نہیں کرتے'' انہیں کانفرنس میں شریک ہونے کی جازت نہیں دی۔

۹۔سورہ ص،آیت ۲۹

۱۰۔سورہ ابراہیم،آیت ۱

۱۱۔سورہ ابراہیم،آیت ۵

۱۲۔مثلاً آیت الکرسی میں ہے۔ الله ولی الذین آمنوا یخرجهم من الظلمت الی النور والذین کفروا اولیاء هم الطاغوت یخرجونهم من النور الی الظلمات۔

۱۳۔سورہ ص آیت ۲۹

۱۴۔حضرات ائمہ معصومین علیہم السلام کے لئے اتفاق واجماعی طور سے ثابت ہے کہ جب آپ حضرات قرآن کی تلاوت فرماتے تھے تو اس خوش الحانی سے تلاوت ہوتی تھی کہ راستہ چلتے ہوئے لوگ اس کی آواز کو سن کر بے اختیار ٹھہر جایا کرتے تھے، ان کی حالت دگرگوں ہوجاتی تھی اور وہ بے تحاشا رونے لگتے تھے۔

۱۵۔سورہ مزمل آیت ۴-۱

۱۶۔امام زین العابدینؑ نے ختم قرآن کی جو دعا تعلیم کی ہے اس میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ خدا یارات کی تاریکیوں میں قرآن کو ہمارا مونس قرار دے ہمیں ایسا عشق اور ایسی سمجھ عطا کردے جس سے رات کی تاریکیوں میں اس کتاب سے انس والفت پیدا ہوجائے۔

۱۷۔سورہ فرقان آیت ۵۲

۱۸۔ہمارے زمانے میں بھی خدا کا یہ سچا وعدہ پورا ہوا اور نسل رسولؐ سے ایک شخص امام خمینیؒ جو مثل اپنے جد کے صرف قرآن وایمان پر بھروسہ کرتا تھا۔لشکر کفار کو شرمناک شکست دی۔

۱۹۔سورہ مائدہ آیت ۸۲

۲۰۔سورہ مائدہ آیت ۸۳

۲۱۔سورہ زمر،آیت ۲۳

۲۲۔جیسے سورہ مریم کی ۸۵ ویں آیت اور سورۂ صف کی ابتدائی آیات وغیرہ

☆☆☆